کوئی شخص ان اہم عہدوں کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب جبکہ اسلامی نظام قائم نہیں ہے' اس کی وہ افادیت نہیں ہے۔ تاہم جب دوبارہ اسلامی نظام قائم ہو جائے گا تو پھر اس قسم کے تعلیمی نصاب کی اہمیت اسی طرح محسوس کی جائے گی۔ واضح رہے کہ درس نظامی میں قرآن مجید کو مرکزی مضمون کی حیثیت سے حاصل نہیں ہے بلکہ یہاں مرکزی مضمون فقہ ہے۔

تیسرا کام جو ہو رہا ہے وہ عقائد کی اصلاح اور توحید کو پختہ کرنے کا ہے لیکن اس کے بعد جہاد کا مرحلہ بالعموم ان لوگوں کے پیش نظر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کے نام پر منفی کام بھی یہاں خاصے بڑے پیمانے پر ہوا۔ قرآن کے نام پر اللہ اور رسول ﷺ کے درمیان تفریق پیدا کی گئی۔ منکرین سنت پیدا ہوئے' پرویزی فرقہ وجود میں آیا۔ ہماری تشخیص یہ ہے اور بعض اکابر امت کی رائے بھی یہی ہے کہ امت کے زوال کا اصل سبب قرآن سے دوری ہے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد اسی رائے کے حامل ہیں۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے اسی بات کو سادہ ترین الفاظ میں جواب شکوہ میں بیان کیا ہے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

علامہ اقبال کی یہ تشخیص ایک حدیث نبویؐ کے عین مطابق ہے۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اب اس قرآن کے نازل ہونے کے بعد اقوام عالم کی تقدیر قرآن حکیم سے وابستہ ہے۔ جو قوم اس کو تھامے گی وہ یہاں عروج حاصل کرے گی اور جو اس قرآن کو چھوڑ دے گی پستی میں گرے گی۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے مزید فرمایا کہ مسلمان کی قوت کی بنیاد ایمان ہے۔ ایمان اگر کمزور ہو گا تو اس کا پورا وجود کمزور ہو جائے گا۔ پھر اس میں تقویٰ' جذبہ جہاد اور ذوق شہادت کہاں سے آئے گا!! گویا پہلی اور اہم ترین چیز ایمان ہے اور ایمان کا منبع و سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ ایمان کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اگرچہ نظری اعتبار سے

© rasailojarai
© rasailojarai

اصل ایمان 'ایمان باللہ ہے اور اصل اہمیت عقیدۂ توحید کی ہے لیکن فقہی اور قانونی اعتبار سے اہم ترین ایمان 'ایمان بالرسل' ہے۔ جو شخص رسول ﷺ پر ایمان نہیں رکھتا وہ اپنی جگہ خواہ بڑے سے بڑا موحد ہوا کرے 'دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ آنحضور ﷺ کا اصل معجزہ یہ قرآن ہے جو آپ کی رسالت کی سب سے بڑی دلیل بھی ہے۔ یس ۝ والقران الحکیم ۝ انک لمن المرسلین ۝ (ترجمہ : قسم ہے اس قرآن حکیم کی کہ آپ یقیناً اللہ کے رسولوں میں سے ہیں) گویا یہاں اللہ تعالیٰ حضورؐ کی رسالت پر قرآن کو بطور گواہ پیش کر رہے ہیں۔ اس اعتبار سے سارے ایمانیات در اصل ایمان بالرسول ﷺ سے جڑے ہوئے ہیں۔ جیسے کسی پیراشوٹ کی ساری رسیاں ایک جگہ آکر جڑ جاتی ہیں اسی طرح تمام ایمانیات 'ایمان بالرسالت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ تقرب الی اللہ کا ذریعہ قرآن مجید ہے۔ تجلیات ربانی کا اگر کوئی مخزن ہے از روئے قرآن تو وہ صرف قرآن مجید ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا کرنے کا جو محیرالعقول کارنامہ بیس سال میں کر دکھایا اس پر اپنے ہی نہیں غیر بھی متحیر ہیں۔ ہمارے لئے اصل قابل غور بات یہ ہے کہ آنحضورؐ کا آلہ انقلاب قرآن حکیم تھا جو آج بھی ایک زندہ کتاب کی حیثیت سے ہمارے پاس موجود ہے۔ قرآن ہی وہ نسخہ کیمیا ہے جو قوموں کی تقدیر بدل سکتا ہے۔

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

اچھی طرح جان لیجئے کہ وہ انقلابی عمل جس کی آخری منزل نظام کو بدلنا ہے اس کا نقطہ آغاز دعوت قرآنی ہے۔ قرآن ہی اس انقلابی نظریئے کا حامل ہے جو ذہنوں کو بدلنے اور انقلاب کی راہ ہموار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن اعلیٰ سے اعلیٰ نظریہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ خیال اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ ترقی دینے والے لوگ موجود نہ ہوں۔ اس کے لئے سخت محنت و مشقت اور پیہم قربانی و جدوجہد درکار ہے۔ اس کے لئے دن رات کے آرام کو تج دینا ہوگا اور اپنے خوشنما مستقبل کو چھوڑنا ہوگا۔ یہ اگر نہیں کریں گے تو یہ اعلیٰ

© rasailojaraid
© rasailojaraid

ترین نظریہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ اس دعوت کے ذریعے سے جو لوگ آئیں' ان کا تزکیہ اور ان کی تربیت و تعلیم بھی قرآن ہی کے ذریعہ سے ہو گا۔ یہ قرآن جب انسان کے اندر جذب ہو گا تو اس کی تاثیر سے نفس کا تزکیہ ہو گا۔ قرآن شفاء لما فی الصدور ہے یعنی باطنی اور روحانی امراض کا علاج ہے۔ اندر کے روگ اسی سے زائل ہوں گے۔ حب دنیا' حب جاہ' حب مال' حسد اور تکبر و غرور یہ سب باطنی امراض ہیں۔ یہ روگ ختم ہوں گے تو اللہ پر ایمان اور اس سے محبت دل میں گھر کر لے گی۔ اسی سے فکر کی اصلاح ہو گی' نظریات کی دنیا میں انقلاب آئے گا' سوچ اور ترجیحات بدل جائیں گی۔ وہ آدمی اندر سے بالکل بدل جائے گا اور اندر کی یہ تبدیلی ایک انقلاب کا پیش خیمہ بن جائے گی۔

ایک ہے قرآن کا معجزہ ہونا وہ تو سب سے پہلے عربوں کے لئے تھا' یا پھر قرآن کی چوٹی کی حکمت ہے اس پر کوئی فلسفی غور کرے' پولیٹیکل سائنس والا غور کرے' اگر وہ جاننا چاہتا ہے کہ جو سیاسی' معاشرتی اور معاشی اصول قرآن نے دیئے ہیں کیا ان سے بہتر بھی کوئی اصول ہیں؟ قرآن حکیم جہاں سرچشمہ ایمان و یقین اور کتاب ہدایت ہے وہاں یہ سیرت نبوی ؐ کا مینول (Manual) بھی ہے۔ اس انقلاب عظیم کے لئے رہنمائی اگر ملے گی تو صرف سیرت رسول ﷺ سے۔ انقلابی مراحل کون کون سے تھے اور ان کی تدریج کیا تھی' اس کی رہنمائی بھی ہمیں سیرت سے حاصل ہوتی ہے جس کے لئے اساس اور بنیاد قرآن حکیم سے فراہم ہوتی ہے۔

دعوت کے ضمن میں ایک مرحلہ آتا ہے تعلیم حکمت کا۔ یعنی قرآن کی تعلیمات اور افکار کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کیا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے جدید علوم کی گہرائی میں اتر کر مطالعہ کیا جائے' ہدایت قرآنی کی روشنی میں ان کے غلط اجزاء پر مدلل تنقید کی جائے اور پھر مثبت طور پر عصر جدید کے تقاضوں کے ضمن میں قرآن حکیم کی رہنمائی کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کیا جائے۔ واضح رہے کہ یہ علوم عصریہ جو ہم پڑھ رہے ہیں یہ علم بھی اللہ نے ہمیں دیا ہے' کسی شیطانی طاقت نے نہیں دیا۔ لیکن ہم نے اس کو اپنی نالائقی سے شیطانی علم بنا دیا ہے' اور وہ اس طرح کہ خالق کائنات یعنی اللہ کے تصور کو ان علوم سے بالکل خارج کر دیا ہے حالانکہ ان دونوں میں ہم آہنگی کے ساتھ ہی حکمت وجود میں آتی

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

ہے۔ یہ وہ کام ہے جس کے لئے ہم نے قرآن اکیڈمی کا تصور دیا ہے اور بحمد اللہ اس نام سے کئی شہروں میں ادارے وجود میں آ گئے ہیں۔ تاہم یہ بات جان لیجئے کہ اس پورے کام کا اصل ہدف ہے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا قیام۔ یہ بات میں نے اول روز ہی سے جب انجمن قائم کرنے کا مرحلہ آیا تھا' تحریری طور پر واضح کر دی تھی کہ انجمن کا قیام میرا آخری ہدف نہیں ہے۔ یہ قرآن کا پڑھنا اور پڑھانا تو اس عظیم کام کا ابتدائی مرحلہ ہے جس کا ہدف غلبہ و اقامت دین ہے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ جامع خطاب سامعین نے بڑی دلچسپی اور توجہ سے سنا۔ بعد ازں قرآن اکیڈمی کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے محترم ڈاکٹر صاحب کو دعوت دی گئی۔ تاہم ڈاکٹر صاحب نے کسی رسمی کارروائی سے گریز کرتے ہوئے دعا کے ہاتھ اٹھا دیئے اور اس نیک کام کی تکمیل کے لئے اللہ سے نصرت و تائید کی دعا کی۔ اس دعا کے ساتھ ہی یہ بھرپور تقریب اختتام کو پہنچی۔

بقیہ : لغات و اعراب قرآن

اَلصّٰبِئِيْنَ ، اَلصّٰبِيْنَ (بغیر ہمزہ) / مَنْ ، مَنْ / اٰمَنَ ، ءَامَنَ ، آٰمَنَ / بِاللّٰهِ ، بِاللّٰهِ ، بِاللّٰهِ / وَالْيَوْمِ ، اَلْيَوْمِ ، اَلْيَوْمِ / الْاٰخِرِ ، اَلْاٰخِرِ ، اٰءَاخِرِ / وَعَمِلَ ، عَمِلَ / صَالِحًا ، صٰلِحًا ، صٰلِحًا (بحذف الف) / فَلَهُمْ ، فَلَهُمْ / اَجْرُهُمْ ، اَجْرُهُمْ ، آٰجْرُهُمْ / عِنْدَ ، عِنْدَ ، عِنْدَ / رَبِّهِمْ ، رَبِّهِمْ / وَلَا ، لَا ، لَا / خَوْفٌ ، خَوْفٌ / عَلَيْهِمْ ، عَلَيْهِمْ / وَلَا (مثل سابق) / هُمْ ، هُمْ / يَحْزَنُوْنَ ، يَحْزَنُوْنَ ، يَحْزَنُوْنَ۔

© rasailojaraid.c

حکمتِ اقبال (۶۱)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور علومِ مروّجہ

خودی اور ایڈلرزم

فرائڈ کے ایک شاگرد ایڈلر (ADLER) نے اپنے استاد کی خیال آرائیوں سے اختلاف کر کے انہیں غلط قرار دیا ہے لیکن اس کے نزدیک انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ اگر جبلتِ جنس نہیں تو جبلتِ تفوق (Self Assertion) ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ انسان کے سارے اعمال و افعال کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر اور برتر بنائے اور دوسروں سے زیادہ قوت اور طاقت حاصل کر کے اُن پر غالب آئے۔ انسانی فرد جب دنیا میں آتا ہے تو کمزور ہونے کی وجہ سے اپنی ہر ضرورت اور خواہش کے لیے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ لیکن وہ اپنے اس کمتری کے مقام سے راضی نہیں ہوتا بلکہ تمنا کرتا ہے کہ جدّوجہد کر کے اپنی کمتری کو دُور کرے اور لوگوں کی توجہ اور ستائش کا مرجع بن جائے اور یہی تمنا اس کی زندگی کی ساری تگ و دو کا سبب بنتی ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ پھر انسان کی فطرت میں نصب العین کی محبت کا مقام کیا ہے اور کیوں جبلتِ تفوق کی بجائے نصب العین ہی انسان کے سارے اعمال کا حکمران نظر آتا ہے تو ایڈلر اس سوال کا جواب فرائڈ ہی کی طرح یہ دیتا ہے کہ نصب العین کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ وہ انسان کی آرزوئے تفوق کی ایک وہمی توجیہ ہوتا ہے۔ انسان کا نصب العین وہی تصور ہوتا ہے جو اس کے خیال میں اُس کی کمتری کی تلافی کر سکتا ہے اور اُسے قوی اور طاقتور بنا سکتا ہے۔ چونکہ افراد کی اپنی کمتری کے تصورات مختلف ہوتے ہیں اس لیے ان کے وہ تصورات بھی مختلف ہوتے ہیں جو اُن کے خیال میں اُن کی کمتری کو دُور کر سکتے ہیں۔ یہی تصورات اُن کے نصب العین ہوتے ہیں۔ چونکہ لوگ حُسن، نیکی اور صداقت کے اوصاف کو پسند کرتے ہیں۔ جو شخص اُن اوصاف کو اپنا لیتا ہے وہ لوگوں میں پسندیدہ ہو جاتا ہے اور لہٰذا قوت اور طاقت حاصل کر لیتا ہے۔ ایڈلر کا نظریہ کئی سوالات پیدا کرتا ہے۔ مثلاً:

© rasailojaraid.com

۱۔ اگر بچہ شروع ہی سے بڑوں میں رہنے کی وجہ سے اپنی کمتری اور دوسروں کی بڑائی کے احساس کا عادی ہو جاتا ہے تو پھر اپنے اس مقام کو ضروری اور قدرتی سمجھ کر اس سے رضامند کیوں نہیں ہو جاتا اور کیوں اس کے خلاف ردعمل کر کے اپنی کمتری کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ بڑائی یا عظمت کی محبت اس کے دل میں شروع سے ہی اس کی فطرت کے ایک ضروری عنصر کے طور پر موجود ہوتی ہے۔ کیا یہ حقیقت فلسفۂ خودی کی تائید مزید نہیں کرتی جس کی رُو سے انسان، خدا اور اس کی صفات حسن، نیکی، صداقت، قوت اور عظمت کی محبت کا ایک جذبہ ہے۔ اگر انسان میں خدا کی محبت کا جذبہ نہ ہوتا تو اس میں عظمت کی محبت بھی نہ ہوتی اور وہ قوت اور عظمت کے حصول کی تمنا بھی نہ کر سکتا۔

بچہ ستائش کا طالب اس لیے ہوتا ہے کہ ستائش حسن کے لیے ہوتی ہے اور وہ بحیثیت انسان کے بڑا حسن آرزو ہے۔ ستائش کے طالب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اُسے معلوم ہے کہ بعض اوصاف ستائش کے قابل ہوتے ہیں اور بعض ستائش کے قابل نہیں ہوتے۔ اس کی خودی میں ایک معیار رکھ دیا گیا ہے جس سے وہ حسن کو غیر حسن سے تمیز کرتا ہے۔ اس معیار پر صرف خدا کا تصور ہی پورا اتر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ معیار خدا کی محبت کا جذبہ نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر کیوں نہ سمجھا جائے کہ انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ خدا کی محبت ہے نہ کہ جبلتِ تفوق!

۲۔ قدرت نے جبلتِ تفوق کا دائرہ کار بہت محدود رکھا ہے۔ یہ جبلت قدرت نے حیوانی مرحلۂ ارتقاء میں حیوان کو اس لیے دی تھی کہ وہ اس کی مدد سے مخالف حملہ آور حیوانات کا مقابلہ کر کے ان پر غالب آسکے تاکہ اپنی زندگی اور نسل کو برقرار رکھ سکے۔ انسان میں آکر بھی اس جبلت کا مقصد اور جبلتوں کی طرح وہی رہتا ہے جو حیوانی مرحلۂ ارتقاء میں تھا یعنی بحیثیت حیوان کے انسان کی بدنی اور حیاتیاتی زندگی کی حفاظت لیکن جس طرح فرائڈ نے جبلتِ جنس کو مضحکہ خیز حد تک وسعت دے کر انسان کے سیاہ و سفید کا مالک فرض کر لیا تھا اُسی طرح ایڈلر نے جبلتِ تفوق کو غیر معمولی حد تک وسعت دے کر انسان کا آمرِ مطلق فرض کر لیا ہے تاکہ فطرتِ انسانی میں نصب العین کے مقام کو نظرانداز کیا جا سکے۔ سوال یہ ہے کہ انسانی مرحلۂ ارتقاء میں ایسا کیوں ہوا ہے اور اس کے ہونے کا ثبوت کیا ہے کہ جبلتِ تفوق اپنے اصلی حیاتیاتی دائرہ کار سے عبور کر کے

© rasailojaraid.com

انسان کی تمام جبلتوں پر حکمران ہو گئی ہے۔

جب ایڈلر کا کوئی معتقد ان سوالات کا ایسا معقول اور مدلل جواب دینے کی کوشش کرے گا جو انسان اور کائنات کے تمام معلوم اور مسلم حقائق کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو تو اس کی توجہ لازماً ایسے حقائق کی طرف ہوگی جن کی روشنی میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ انسان کے اعمال کی قوت محرکہ جبلت تفوق نہیں بلکہ خدا اور اس کی صفات (حسن، نیکی، صداقت، قوت، عظمت وغیرہ) کی محبت ہے اور یہی نتیجہ فلسفہ خودی کا نچوڑ ہے۔

خودی اور میکڈوگل ازم

میکڈوگل (Mc Dougall) کے نزدیک انسان کے اعمال کی قوت محرکہ اس کی جبلتیں ہیں وہ لکھتا ہے:

"جبلتیں انسان کے سارے اعمال کی حرکت میں لانے والی بنیادی قوتیں ہیں۔"

© rasailojaraid.c

میکڈوگل تسلیم کرتا ہے کہ انسان اور حیوان کی جبلتیں ایک ہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ضروری ہے کہ حیوان اور انسان کے فطرتی رجحانات اور قدرتی اعمال و افعال بھی ایک ہی ہوں لیکن ہم جانتے ہیں کہ انسانی فطرت کے بعض امتیازات ایسے بھی ہیں جو حیوان میں موجود نہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان کسی علمی، اخلاقی، روحانی یا جمالیاتی نصب العین کی خاطر اپنی جبلتوں کی مخالفت کر سکتا ہے لیکن حیوان جبلتوں کی مخالفت نہیں کر سکتا کیونکہ نصب العین کی محبت کا جوہر حیوان میں موجود نہیں۔ لیکن یہ نصب العین کی محبت انسان میں کہاں سے آئی ہے؟ فطرت انسانی میں اس کا ماخذ، مقام اور مدار کیا ہے؟ کیا یہ بھی کوئی جبلت ہے؟ میکڈوگل کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک جبلت نہیں بلکہ ایک جذبہ ہے جو جبلتوں کی ترکیب سے پیدا ہوتا ہے۔ اس جذبہ کو وہ جذبۂ ذات اندیشی کا نام دیتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ یہ جذبہ جبلت تفوق کی مدد سے دوسری جبلتی خواہشات کی مخالفت کرنے پر قادر ہوتا ہے۔

میکڈوگل کا یہ نظریہ بہت سے اعتراضات کی زد میں آتا ہے مثلاً:

۱۔ اگر انسان کے اندر اس کی حیوانی جبلتیں مل کر اور ترکیب پا کر نصب العینی خواہش پیدا کر سکتی ہیں تو حیوان میں کیوں پیدا نہیں کرتیں؟ بالخصوص جب میکڈوگل تسلیم کرتا ہے کہ انسان اور حیوان میں جو چیز امتیاز پیدا کرتی ہے وہ فقط عقل ہے جو انسان میں ہے اور حیوان میں نہیں اور انسانی عقل انسانی

© rasailojaraid.c

جبلتوں کی اُس ترکیب کا سبب نہیں جو جذبۂ ذات اندیشی کی صورت اختیار کرتی ہے۔

۲۔ اگر نصب العینی خواہش جبلتوں کی ترکیب سے پیدا ہوئی ہے تو وہ جبلتوں کی مخالفت کیوں کرتی ہے؟ یہاں تک کہ اُس کی خاطر ایک انسان بعض وقت نہ صرف اپنی جبلتی ضروریات کو بلکہ اپنی زندگی کو بھی (جس کی حفاظت کے لیے وہ موجود ہوئی ہیں) قربان کر دیتا ہے۔ اور پھر نصب العینی خواہش جبلتی خواہشات کو، میکڈوگل کے اپنے الفاظ میں "خوف" (Horror) اور "حقارت" (Detestation) کی نگاہ سے کیوں دیکھتی ہے؟

۳۔ بعض وقت جبلتِ تفوق کا مقصد نصب العینی خواہش کے مقصد کے بالکل برعکس قسم کا ہوتا ہے۔ جبلتِ تفوق تو فقط غلبہ کا تقاضا کرتی ہے لیکن بعض وقت ایک انسان اپنے نصب العین کی ناداری، کمزوری، بیچارگی اور ذلت بلکہ موت تک کو بخوشی قبول کر لیتا ہے۔ ایسی حالت میں جبلتِ تفوق جو غلبہ چاہتی ہے جذبۂ ذات اندیشی یا نصب العینی خواہش کی مدد کیونکر کرتی ہے؟ اگر نصب العینی خواہش کی تشریح کے لیے فلسفۂ خودی کی اس روشنی کو قبول کر لیا جائے کہ نصب العین کی محبت انسانی فطرت کا ایک مستقل جذبہ ہے جو جبلتوں کے کسی مرکب سے پیدا نہیں ہوا تو اس تشریح پر اس قسم کے کوئی اعتراضات وارد نہیں ہو سکتے۔

خودی اور مارکسزم

کارل مارکس (Karl Marx) کے نزدیک بنیادی طور پر انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ جبلتِ تغذیہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ حیوان خوراک حاصل کر کے اپنی زندگی کو برقرار رکھے۔ چونکہ خوراک کا مقصد زندگی کا قیام ہے، کارل مارکس خوراک کی ضرورت میں انسان کی اور ایسی ضرورتیں بھی شامل کرتا ہے جن کی تشفی بقائے حیات کے لیے ضروری ہے، مثلاً موسم کے مطابق کپڑا اور گرمی اور سردی سے بچاؤ کے لیے رہائشی مکان وغیرہ، اور ان سب کو ملا کر وہ اقتصادی ضروریات کا نام دیتا ہے۔ کارل مارکس تسلیم کرتا ہے کہ انسان اخلاقی، مذہبی، روحانی، علمی، جمالیاتی اور سیاسی نصب العینوں سے محبت کرنے کی استعداد رکھتا ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ انسان کے اعمال بظاہر نصب العینوں کی خاطر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ تاہم وہ نصب العینوں کے لیے شعور (Consciousness) یا مشتملاتِ شعور (Contents of

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com